خطبہ جمعہ

صبر کے لئے دعا مانگنا اور صبر کے ساتھ دعا مانگنا یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں

اللہ سچی روح کو کبھی ضائع نہیں ہونے دیتا

سچی روح کے ساتھ اس کے حضور اگر آنسو کا قطرہ بھی بہایا جائے تو پھر وہی رحمتوں کی مسلسل موسلا دھار بارشیں بن جاتا ہے

خطبہ جمعہ ارشاد فرمودہ سیدنا امیر المومنین حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز - فرمودہ ۱۶ر اکتوبر ۱۹۹۸ء بمطابق ۱۶ر اخاء ۱۳۷۷ ھجری شمسی بمقام مسجد فضل لندن (برطانیہ)

(خطبہ جمعہ کا یہ متن ادارہ الفضل اپنی ذمہ داری پر شائع کر رہا ہے)

أشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له وأشهد أن محمداً عبده و رسوله-

أما بعد فأعوذ بالله من الشيطان الرجيم- بسم الله الرحمٰن الرحيم -

الحمدلله رب العٰلمين - الرحمٰن الرحيم - مٰلك يوم الدين - إياك نعبد و إياك نستعين -

اهدنا الصراط المستقيم - صراط الذين أنعمت عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضالين-

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ . اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ. وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾

(سورۃ البقرہ: ۴۵ تا ۴۷)

سورۃ البقرہ آیات ۴۵ تا ۴۷ ہیں جن کی میں نے تلاوت کی ہے۔ ان آیات میں سے پہلی آیت خصوصیت کے ساتھ یہود علماء کو مخاطب ہے۔ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ میں یہود عامۃ الناس پیش نظر نہیں یعنی بطور خاص پیش نظر نہیں مگر یہود علماء پیش نظر ہیں کیونکہ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ جملہ بتا رہا ہے کہ وہ یہودی جو کتاب پڑھا کرتے تھے اور عموماً یہود عوام الناس ان کتاب پڑھنے والوں ہی سے ہدایت مانگا کرتے تھے اس لئے خصوصیت سے اہلِ کتاب علماء مراد ہیں۔ مگر جو ان کی صفات بیان کی گئی ہیں وہ صفات جب بھی جس قوم کے علماء پر اطلاق پائیں گی وہ سارے مراد ہونگے۔ قرآن کریم تاریخ سے سبق لینے کے لئے یہ طریق اختیار کرتا ہے کہ پرانے علماء یا پرانی قوموں کے حالات بیان کرتے ہوئے ان کی مشابہتیں پیش نظر رکھتا ہے۔ جب بھی، جس قوم کو بھی ان سے مشابہت ہو گی وہی قرآن کے مخاطب ہونگے۔ تو اس تمہید کے ساتھ میں اب ان آیات کا ترجمہ اور کچھ ان کی تفسیر بیان کرتا ہوں۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ یہود علماء اپنے اس دور میں جس میں حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام ان کی اصلاح کے لئے نازل ہوئے، اس دور میں کثرت کے ساتھ ان بیماریوں کا شکار ہو گئے تھے۔ تلاوت تو کتاب کی کرتے تھے مگر اپنے نفوس کو بھول جاتے تھے۔ یعنی تلاوت کرتے تھے اور اس تلاوت سے جو کچھ بھی لوگوں کے سامنے بیان کرتے تھے وہ اچھا تھا یا برا، بعض دفعہ وہ تبدیل بھی کر دیا کرتے تھے مگر یہاں وہ تبدیلی مراد نہیں ہے، مراد یہ ہے کہ وہ تلاوت کتاب سے یہ معاملہ جان لیتے تھے کہ اللہ تعالیٰ تقویٰ کی تعلیم دے رہا ہے نیکیوں کو پورے خلوص کے ساتھ اختیار کرنے اور بدیوں کو پورے عزم کے ساتھ ردّ کرنے کا حکم دے رہا ہے۔ یہ بات بیان کرتے وقت وہ اپنے نفوس کو بھول جایا کرتے تھے۔

یہ اپنے نفوس کو بھولنے کے دو معانی ہیں۔ ایک تو یہ کہ خود اپنے اوپر ان نیکیوں کا، ان نصیحتوں کا عمل نہیں ہوا کرتا تھا۔ بدکردار لوگ تھے لوگوں کے سامنے تو نیکیاں بیان کرتے تھے مگر خود اپنے حال پر کبھی نظر نہیں ڈالتے تھے کہ ہم خود بھی ان نیکیوں کو اختیار کر رہے ہیں یا نہیں۔ اَنْفُسَكُمْ کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اپنے عزیز و اقارب، اپنے قریبی، اپنی جانوں کو جو ان سے تعلق رکھتی ہیں ان کے معاملے میں آکر تو آنکھیں موند لیا کرتے تھے، آنکھیں بند کر لیا کرتے تھے۔ وہ جس حال میں تھے جو کچھ کرتے رہے تھے وہی ان کو اچھا لگتا تھا اور ان کو خاص طور پر نیکیوں کا حکم اور بدیوں سے روکتے نہیں تھے۔ تو یہ سارے معانی اسی آیت کریمہ کے اس محاورے میں شامل ہیں۔ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ عوام الناس کو تو تم نیکیوں کا حکم دیتے ہو وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ مگر اپنی جانوں کو اور اپنے عزیز و اقارب کو بھول جاتے ہو۔

وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اور یہاں تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ خبردار تمہیں پتہ ہے کہ جس عادت میں تم مبتلا ہو اس کو کتاب ردّ کر رہی ہے، جانتے بوجھتے ہوئے ایسا کرتے ہو۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ پس کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے یا عقل سے کام نہیں لو گے۔

اب جو اگلی آیت کریمہ ہے یہ تمام بنی نوع انسان کو لیکن خصوصیت سے مسلمانوں کو مخاطب ہے وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اور مدد مانگو صبر کے ساتھ اور صلوٰۃ کے ساتھ۔ اب بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ کے دو معانی ہیں جو بیک وقت موجود ہیں۔ ب کا مطلب ایک تو یہ بنتا ہے کہ صبر کی ہی دعا مانگو اور نماز کی دعا مانگو اور دوسرا معنی یہ ہے کہ صبر کے ساتھ دعا مانگو اور نماز کے ساتھ دعا مانگو۔ عموماً مترجمین یہ دوسرا معنی اختیار کر لیتے ہیں حالانکہ یہ دونوں بیک وقت مراد ہیں اور ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہوتے ہیں۔

صبر کے لئے دعا مانگنا اور صبر کے ساتھ دعا مانگنا یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ اگر صبر کے لئے دعا مانگی جائے تو جب تک صبر کے ساتھ دعا نہ مانگی جائے اس دعا کے مقبول ہونے کے امکانات دور کے ہو جاتے ہیں۔ یعنی بعض دفعہ جلدی بھی دعا قبول ہو جاتی ہے مگر بسا اوقات انسان آزمایا جاتا ہے اور اگر اس کی واقعۃً نیت ہے کہ وہ ایک چیز کو اللہ سے چاہتا ہے تو پھر اسے پکڑ بیٹھے اور یہ مضمون ہے بِالصَّبْرِ۔ صبر کرو اور جو نیکی کی دعا تم مانگ رہے ہو اگر تم اس میں واقعۃً سچے ہو، اسی کو پسند کرتے ہو اس نیکی کی دعا ہمیشہ مانگتے رہو کیونکہ وہ تو کسی حال میں بھی بے ضرورت نہیں رہتی۔ نیکی کی تو ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔ پس نیکی پر صبر کرنا اور نیکی پر صبر کرنے کے لئے دعا پر صبر کرنا کہ اللہ ہمیں نیکی عطا فرمائے یہ ایک ہی چیز کے دو معنے ہیں، ایک معنی کے دو الفاظ ہیں۔

وَالصَّلٰوةِ اور نماز پر بھی صبر والا حکم عائد ہوتا ہے۔ پس اس کو پیش نظر رکھنا بہت ضروری ہے کہ **ہم جو نمازیں پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اور نیکیوں کو مضبوطی سے اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہ ممکن نہیں ہے جب تک پورے خلوص نیت کے ساتھ ہم اس کے لئے دعا نہ کرتے رہیں۔** اور دعا کی وجہ یہ بیان فرمائی وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ کہ یہ نیکی اور نماز پر صبر کرنا اور صبر کے ساتھ نماز پڑھنا اور نماز کی دعا کرنا یہ بذات خود وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ بہت بڑی بات ہے، بہت مشکل کام ہے اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ سوائے ان لوگوں کے جو خشوع کرتے ہیں۔ تو قرآن کریم کی آیات کا پہلا حصہ دوسرے کی تشریح کر رہا ہوتا ہے اور دوسرا حصہ پہلے کی تشریح کر رہا ہوتا ہے اور ان دونوں کے درمیان ایک اٹوٹ جوڑ ہوا کرتا ہے، نہ ٹوٹنے والا ایک رشتہ ہے۔

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ اور خشوع کی وجہ پھر اگلی آیت میں بیان فرما دی گئی۔ خاشعین پر نہ صبر بھاری ہے، نہ نماز بھاری ہے۔ مگر خاشعین ہوتے کون ہیں الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ جو یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ضرور ملنے والے ہیں وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اور یقیناً وہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ یہاں يَظُنُّوْن کا ترجمہ میں نے "یہ گمان کرتے ہیں" کیا ہے حالانکہ لغات کی کتب قرآن کریم کی اسی آیت کے حوالے سے "یقین رکھتے ہیں" کا ترجمہ پیش کرتی ہیں۔ یہ اس معروف مسلمہ ترجمے سے جس کو مسلمان اہل لغت پیش کرتے ہیں میں نے کن معنوں میں احتراز کیا ہے۔ یہ میں آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں۔

قرآن کریم کے نزول سے پہلے عربوں میں بعض محاورے رائج تھے اور ظن کا محاورہ امید یا توقع کے معنوں میں استعمال ہوا کرتا تھا، یقین کے معنوں میں نہیں۔ مگر جو اہل اللہ جانتے ہیں کہ انہوں نے لازماً پیش ہونا ہے اس لئے وہ اللہ کے سامنے پیش ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔ اس پہلو سے اس کا ترجمہ 'یقین' قطعی اور لازمی ہے۔ لیکن پیش ہونے پر یقین رکھنا اَور ہے اور لقاء پر یقین رکھنا اَور ہے۔ لقاء کا ایک معنی ہے اس کے دربار میں ہمیں رسائی ہو گی، ہم اس سے ملاقات کریں گے یعنی ایک مجرم کے طور پر نہیں بلکہ یہ توقع رکھتے ہوئے کہ وہ ہم پر پیار کی نگاہ ڈالے گا اور ہمیں لقاءِ باری تعالیٰ ایسے نصیب ہو گی جیسے بعض دفعہ بادشاہ کسی کو اجازت دے دیتے ہیں کہ ان کے دربار تک پہنچے۔

تو لقاء کے دو معنے ہیں جسے یاد رکھنا چاہئے بعض لوگوں کو پیشی کے لئے بلایا جاتا ہے تاکہ ان کی جواب طلبی ہو اس کو لقاء ان معنوں میں نہیں کہہ سکتے جس میں محبت اور چاہت اور اعزاز کا مضمون ہو۔ اور ایک لقاء ہے جسے دیدار کرانا مقصود ہوا کرتا ہے یعنی لقاء سے مراد ہے اللہ اپنا دیدار کرواتا ہے اور ان کا

دیدار کرتا ہے۔ تو یہ وجہ ہے کہ یَظُنُّوْن کا لفظ یہاں میرے نزدیک اول معنے وہی رکھتا ہے جو ظن کے معنے ہیں اور اس میں ایک حکمت ہے۔ مومن اپنے اعمال کے اعتبار سے کبھی بھی یقین نہیں کرتے کہ وہ ضرور بخشے جائیں گے۔ وہ اپنے نفس کو جانتے ہیں، اپنی کمزوریوں کو بھی جانتے ہیں۔ مگر جتنا زیادہ بڑا اہل اللہ ہوگا اتنا ہی زیادہ اس میں انکساری پائی جائے گی۔ اس لئے وہ لقاء کی امید تو بہت رکھتے ہیں لیکن یہ گمان ہے کہ اللہ ہمیں اپنے لقاء کا موقع عطا فرمائے گا۔ یقین میں ایک قسم کا استکبار بھی پیدا ہو جاتا ہے، ایک قسم کا تکبر بھی ہوتا ہے کہ ہم! ہم تو اتنے اعلیٰ لوگ ہیں یہ ہو کیسے سکتا ہے کہ اللہ ہمیں لقاء نہ بخشے اور ان معنوں میں کہ وہ یقین رکھتے ہیں کہ خدا سے ضرور ملیں گے یہ ہو ہی نہیں سکتا۔

حضرت اقدس محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم سے بڑھ کر عارف باللہ کوئی نہیں تھا مگر اپنی بخشش کے متعلق فرماتے ہیں کہ اللہ کے فضل ہی سے بخشا جاؤں گا تو یہ انکسار کی انتہا ہے جس کے نتیجے میں لفظ یقین یہاں اطلاق نہیں پاتا۔ امید تو بہت رکھتے ہیں، خواہش بہت ہے، حرص ہے دل کو، ان معنوں میں ظن ہے مگر یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ مرنے کے بعد ضرور خدا ہمیں بلائے گا۔ وہ ہوتے کون ہیں جو یہ یقین کر سکیں کہ اللہ ہمیں ضرور بلائے گا۔ پس اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّھِمْ وَاَنَّھُمْ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ اب اس بات کا تو یقین ہے کہ اس کی طرف لوٹ جائیں گے مگر یہ ضروری نہیں کہ لقاء کے لحاظ سے لوٹیں گے یعنی پیار و محبت کی ملاقات کے لحاظ سے، وہ تو اس کی مرضی ہے مگر لوٹنے کا یقین ضرور رکھتے ہیں اور اس یقین کی وجہ سے خشیت پیدا ہوتی ہے لقاء کے اعلیٰ درجے کے معنوں کے لحاظ سے نہیں مگر پیشی کے لحاظ سے کہ مجھے پیش ضرور ہونا ہے۔ ان کے دل میں بہت خشیت پیدا ہوتی ہے اور وہ ڈرتے رہتے ہیں اور عاجزانہ اس کی راہوں پہ بچتے چلے جاتے ہیں کہ ہمارا حساب آسان ہو جائے۔

یہ آیات کریمہ ہیں جنکی براہ راست یا اشارۃً تشریح حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے مختلف اقتباسات میں فرمائی ہے یعنی مختلف تحریروں میں یا ملفوظات میں فرمائی ہے جن میں سے اقتباس لئے گئے ہیں۔ پہلا اقتباس ضمیمہ براہین احمدیہ (روحانی خزائن جلد ۲۱ مطبوعہ لندن صفحہ ۱۸۹) سے لیا ہے۔ "خشوع کی حالت اسوقت تک خطرے سے خالی نہیں جب تک کہ رحیم خدا سے تعلق نہ پکڑلے"۔ اب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے الفاظ جیسا کہ میں بارہا توجہ دلا چکا ہوں بہت غور سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔ رحمٰن سے تعلق تو ذہن میں از خود ابھر آتا ہے اور ایک عام انسان یہی خیال کرے گا کہ لفظ رحمٰن ہونا چاہئے نہ کہ رحیم، "خشوع کی حالت اس وقت تک خطرے سے خالی نہیں جب تک کہ رحیم خدا سے تعلق نہ پکڑلے"۔

رحمٰن کو چھوڑ کر جو اول صفت ہے جس میں سب سے زیادہ مخلوقات سے تعلق کا اظہار ہے اس کو چھوڑ کر جو رحیم کو اخذ فرمایا گیا اس میں گہری حکمت ہے جو مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام خود کھول رہے ہیں۔ رحیم عمل کی جزا دیا کرتا ہے اور بد عمل کی بد جزا بھی دیا کرتا ہے تو اگرچہ رحیم میں چونکہ رحم کا مضمون ہے اس لئے یہ تو ہو سکتا ہے کہ نیک عمل کی بہت زیادہ جزا دے مگر رحیم میں چونکہ عمل کی جزا کا عمومی مفہوم داخل ہے اس لئے بد عمل کی اتنی جزا ضرور دے گا جتنا بد عمل ہو۔ تو بدیاں اتنی ہی سزا کی مستحق ٹھہریں گی، اتنی ہی سزا کی سزاوار ٹھہریں گی جتنی سی بدی ہے اور یہ رحیمیت کے نتیجے میں ہوا کرتا ہے۔ جزا سزا کا سارا عمل جو ہم اس دنیا میں دیکھتے ہیں یہ تمام نظام رحیمیت کے نتیجے سے تعلق رکھتا ہے۔

پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں: "یاد رہے کہ جب خدا تعالیٰ کا فیضان بغیر توسط کسی عمل کے ہو تو وہ رحمانیت کی صفت سے ہوتا ہے"۔ رحمانیت میں عمل کا توسط کوئی نہیں ہے۔ جب انسان تھا ہی نہیں اس وقت رحمٰن نے اس کو پیدا فرمایا، تمام انعامات اس پر کئے جبکہ کوئی مانگنے والا نہیں تھا لیکن ایک دفعہ جو انعام فرما دئے ان کا حساب بھی ہوگا اور پھر اگر اس رحمانیت کے تعلق کو کوئی برقرار رکھنا چاہے تو رحیمیت کی صفت کو ملحوظ رکھے بغیر ایسا ممکن ہی نہیں ہے۔ "جب خدا تعالیٰ کا فیضان بغیر توسط کسی عمل کے ہو تو وہ رحمانیت کی صفت سے ہوتا ہے جیسا کہ جو کچھ خدا نے زمین و آسمان وغیرہ انسان کے لئے بنائے یا خود انسان کو بنایا یہ سب فیض رحمانیت سے ظہور میں آیا لیکن جب کوئی فیض کسی عمل اور عبادت اور مجاہدہ اور ریاضت کے عوض میں ہو وہ رحیمیت کا فیض کہلاتا ہے"۔

جس خدا سے آئے ہیں اس کی طرف واپسی کا سفر شروع ہو گیا ہے، بہت دور نکل جاتے ہیں اس سے، رحمانیت کے تعلق کو بھول جاتے ہیں اور اس دنیا میں بہت دور تک بھٹک جاتے ہیں پھر اس کی طرف جو واپسی شروع ہوتی ہے یہ ایسے ہی ہے جیسے پہاڑ سے اترنے کے بعد پھر چڑھائی شروع ہو جائے۔ پہلے جو پہاڑ کی چوٹیاں نصیب تھیں وہ فضل کے طور پر تھیں ہر کس و ناکس میں یہ طاقت نہیں تھی کہ اس بلند پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ سکے جو رحمانیت کے ساتھ انسان کو متعارف کراتا ہے۔ مسلسل نزول ہے انسان کا، رحمانیت سے چلتے ہوئے وہ آخر اس کھڈ تک پہنچ جاتا ہے جس سے آگے پھر نیچے جانا ممکن نہیں ہوا کرتا پھر وہ جن کو بلند چوٹیاں دکھائی دیں اور اچھی اور پیاری لگیں ان کے دل میں ایک بے تاب تمنا بیدار ہو گی کہ واپس ان چوٹیوں کی طرف سفر شروع کریں۔

یہ مشکل سفر ہے، یہ محنت طلب سفر ہے اس میں صبر اور صلوٰۃ کے ساتھ مدد مانگنا ضروری ہے ورنہ جن لوگوں کو یہ تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ کوئی کہیں کھڑا ہو جاتا ہے، کوئی کہیں کھڑا ہو جاتا ہے، چڑھتے چڑھتے انتظار کرتا رہتا ہے کہ اب یہ چوٹی سر ہو گئی لیکن اس کے اوپر اور بھی چوٹیاں ہوتی ہیں وہ سر کرتے کرتے پھر انسان سمجھتا ہے کہ اب میں اس مقام پہ پہنچ گیا ہوں جو سب سے بلند و بالا ہے۔ اوپر پھر ایک اور چوٹی دکھائی دیتی ہے۔ یہ چوٹیاں جو دنیاوی پہاڑوں کی چوٹیاں ہیں یہ تو بعض دفعہ پہاڑوں میں ایک مقام تک پہنچ کر ختم ہو جایا کرتی ہیں مثلاً ہمالہ ہے تو ہمالیہ پہاڑ کی آخری چوٹی ہے وہاں پہنچ کر انسان کہہ سکتا ہے کہ میں نے سب کچھ پالیا لیکن جو اللہ تعالیٰ کی رحمانیت کی طرف رخ ہے اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کتنی بڑی بلندی ہے جس کی طرف ہم نے چڑھنا ہے۔

تو اگر ہمالہ کی چوٹی تک جاتے جاتے انسان جان جوکھوں میں ڈالتا ہے، طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہوتا ہے اور کئی قسم کے خطرات مول لیتا ہے۔ قدم پھسل جائے تو وہ ترقی کی بجائے تنزل کا گڑھا اس کا مقدر بن جاتا ہے جس سے پھر کبھی نکل نہیں سکتا، یعنی موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہ سارے مضامین ہیں جو رحیمیت اور رحمانیت کے موازنے کو آپ پر کھولتے ہیں اور یہی موازنہ ہے جو حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس تحریر میں فرما رہے ہیں۔ "جو کچھ خدا نے زمین و آسمان وغیرہ انسان کے لئے بنائے یا خود انسان کو بنایا یہ سب فیض رحمانیت سے ظہور میں آیا لیکن جب کوئی فیض کسی عمل اور عبادت اور مجاہدہ اور ریاضت کی عوض میں ہو وہ رحیمیت کا فیض کہلاتا ہے۔ یہی سنت اللہ بنی آدم کے لئے جاری ہے"۔ یعنی کوئی بنی آدم اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ "پس جبکہ انسان نماز اور یاد الٰہی میں خشوع کی حالت اختیار کرتا ہے تب اپنے تئیں رحیمیت کے فیضان کے لئے مستعد بناتا ہے"۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۱۸۹)

یہ جو خشوع ہے اس کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بعض تنبیہات بھی فرمائی ہیں یہ میں ابھی آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ کیونکہ خشوع کے مضمون کو سمجھنے میں بعض دفعہ رقت ایک دِقت پیدا کر دیتی ہے۔ اب واقعات خواہ دینی ہوں یا دنیاوی ہوں اللہ کا ذکر جب آپ کریں اور اس رنگ میں ذکر ہو اس کے بندوں سے سلوک کا کہ وہ رنگ اپنی ذات میں دردناک رنگ ہو یا حضرت اقدس محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کا ذکر کریں اور وہ ذکر ایسا ہو کہ اس کو پڑھتے ہوئے بے اختیار انسان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں اور بیان کرتے وقت اور بھی مشکل ہو جاتی ہے پڑھتے وقت تو انسان کچھ ضبط کر سکتا ہے مگر وہی دردناک واقعہ اگر بیان کرے تو بڑی مشکل پیش آتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ آنسو جو ایک دردناک واقعہ کے نتیجے میں پھوٹتے ہیں کیا وہ خشیت کا نشان ہیں، کیا اس کو خشوع خضوع کی علامت سمجھا جا سکتا ہے کہ نہیں۔ یہ مضمون بہت باریک اور بڑی محنت سے نتھارنے والا ہے اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ معرکہ فرمایا کہ اس مضمون کے مختلف پہلو کھول کھول کر بیان کر کے واعظین کے لئے بھی اور ہر کس و ناکس کے لئے اس مضمون کو ایسا کھول دیا ہے کہ پھر اس میں کسی قسم کے اشتباہ کا کوئی سوال باقی نہیں رہتا۔ اب دیکھیں کئی لوگ جانتے ہیں کہ قصہ پڑھ رہے ہیں اور وہ قصہ دردناک ہوتا ہے۔ اس قصے پر بعض دفعہ لوگ بلک بلک کر روتے ہیں، بعض بچے جب کوئی دردناک کہانی پڑھتے ہیں تو اتنا روتے ہیں کہ ان کی کتاب ہاتھ سے گر جاتی ہے اور روتے روتے سو بھی جاتے ہیں۔ اب اس کو خشوع خضوع تو نہیں کہہ سکتے۔ اگرچہ خشوع و خضوع کے مشابہ معنی ضرور ہیں مگر یہ خشوع و خضوع نہیں ہے اس کے نتیجے میں ان کو کوئی جزاء نہیں دی جائے گی، کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔ یہ دراصل نفس کی ایک حالت ہے جس سے لطف محسوس ہوتا ہے۔ جو دل کا درد ہے جب وہ آنکھوں سے ابل پڑے تو ایک سکون ملتا ہے اور آنسو بھی اس لحاظ سے رحمت ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم نے انہیں رحمت ہی قرار دیا اور وہ بد نصیب بدو جو سمجھتے تھے کہ آنکھ کی سختی یہ مردانگی کی علامت ہے اور رونا ایک زنانہ نشان ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم جب خود رو پڑتے تھے تو اگرچہ رونا ان معنوں میں تھا جن معنوں میں میں خشوع و خضوع کی اب بات کر رہا ہوں بہت گہرا اور حقیقی عرفان پر مبنی ہوا کرتا تھا مگر آنسوؤں کو آپ نے بہر حال رحمت قرار دیا ہے سمجھانے کی خاطر کہ جس کو اللہ کی رحمت ہی نصیب نہیں ہوئی اس کی آنکھیں خشک ہیں اس کے لئے میں کیا کر سکتا ہوں۔ پس یہ رونے کی صلاحیت کے اعتبار سے دردناک واقعات کو پڑھ کر آپ یہ تو معلوم کر سکتے ہیں کہ آپ کے اندر صلاحیت ہے کہ نہیں مگر اس سے زیادہ نتیجہ نہیں نکال سکتے۔ کچھ ایسے بد نصیب ہوتے ہیں جیسے عرب کے بدو، جن کے متعلق میں نے

بیان کیا ہے کہ ان کی آنکھیں پتھر کی طرح ہوا کرتی تھیں۔ جتنا مرضی دردناک واقعہ ہو جائے، پڑھیں یا سنائیں ان کی آنکھوں میں کوئی آنسو نہیں آئے گا۔ اس لئے کہ وہ ان چیزوں سے بالکل بے تعلق ہوتے ہیں اور رونے کا ایک تعلق کے ساتھ تعلق ہے۔ جب آپ قصہ پڑھتے ہیں تو فرضی کردار سہی لیکن وقتی طور پر انسان ایک Make Beliefe کے طور پر یعنی بغیر شعور کے از خود اس پر یقین کرنے لگ جاتا ہے اور ایک دفعہ ایک بچے کو میں نے دیکھا جب اس کو رونا آرہا ہوتا تھا کتاب پڑھتے وقت تو ایک دم ہاتھ ہٹا کے کہتا تھا 'نہیں نہیں یونہی واقعہ ہے کچھ بھی نہیں ہے'۔ یہ ہمارے گھر کے بچوں میں سے ایک تھا تو مجھے ہنسی بھی بہت آئی لیکن اس کی ذہانت کا بھی میں قائل ہوا اس کو یہ پتہ تھا کہ مجھے رونا اس لئے آرہا ہے کہ میں ان باتوں پہ یقین کر رہا ہوں اس لئے وہ بار بار کہتا نہیں نہیں کوئی نہیں ہر گز نہیں، یہ ایسا کوئی نہیں ہوا، خیالی باتیں ہیں اور اس طرح اپنے آنسوؤں کو روک رہا تھا مگر یہ تو اس کو پتہ چل سکتا تھا اور چل گیا کہ میرا دل نرم ہے اور دردناک باتوں پہ رونا آتا ہے مگر تعلق کی وجہ سے آتا ہے یہ بھی اس کو پتہ تھا جب تعلق کاٹ دو تو پھر کوئی رونا نہیں آتا۔

تو **خشوع و خضوع دو طریق پر ہوا کرتا ہے**۔ ایک فرضی تعلق پر اور ایک حقیقی تعلق پر۔ اب ماں جب بچے کے لئے روتی ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ یہ دکھاوا ہے۔ وہ ایک گہرا تعلق ہے اور وہی ماں جب فرضی قصوں پر روتی ہے تو دکھاوا نہ سہی مگر حقیقت نہیں ہے۔ یہ ہے مضمون جو بہت باریک تجزیہ کو چاہتا ہے ورنہ ہمیں کیا پتہ کہ ہم اللہ کی خشیت سے رو رہے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کی محبت سے رو رہے ہیں یا ویسے ہی واقعات ہی دردناک ہیں ان کی وجہ سے ہمیں رونا آرہا ہے۔ یہ تمہید ہے ان اقتباسات کے لئے جو میں نے بیان کی جو میں ابھی آپ کے سامنے پڑھ کے سناتا ہوں۔

اور ایک اور پہلو بھی اس کا یہ ہے کہ بعض اوقات خشوع و خضوع وقتی طور پر آتا ہے اور بعض دفعہ مستقل اثر پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ یہ ساری باتیں ایسی ہیں جو ان اقتباسات میں جو میں بیان کروں گا، پڑھ کے سناؤں گا، ان میں موجود ہیں۔

ملفوظات جلد اول، (جدید ایڈیشن) صفحہ ۱۰۰۔۱۰۱، حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں: "خدا تعالیٰ نے انسان کی قضاء و قدر کو مشروط کر رکھا ہے"۔ قضاء و قدر بھی مشروط ہے یعنی یہ خیال کر لینا کہ قضاء ہے جو لازماً جاری ہوگی اور اس کو ٹالا نہیں جا سکتا، یہ درست نہیں۔ کیونکہ قضاء کو کیسے ٹالا جا سکتا ہے یہ بھی ایک قضاء ہے اور قضائے الٰہی کا ایک حصہ ہے۔ اگر آپ کو علم ہو کہ قضاء کتنے وسیع مضمون پر اطلاق پاتی ہے اور قضاء کے اندر قضاء چلتی ہے تو پھر یہ مشکلات آسانی سے حل ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں "خدا تعالیٰ نے انسان کی قضاء و قدر کو مشروط کر رکھا ہے جو توبہ، خشوع و خضوع سے ٹل سکتی ہے۔ جب کسی قسم کی تکلیف اور مصیبت انسان کو پہنچتی ہے تو فطرتاً اور طبعاً اعمال حسنہ کی طرف رجوع کرتا ہے"۔

ہر تکلیف کے وقت انسان خدا کی طرف لوٹتا ہے اور اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کا ایک یہ بھی معنیٰ ہے یعنی کہیں کسی مقام پر اسے ایسا دھکا لگتا ہے کہ خدا سے دوری کا سفر اس کے قریب کے سفر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جیسے پتھر دیوار پر ماریں تو وہ لوٹ کر آتا ہے اس طرح بعض دیواروں سے سر ٹکرانے کے بعد انسان کو خدا یاد آتا ہے اور وہ پتھر کی طرح واپس لوٹتا ہے لیکن ان دونوں میں پھر فرق ہے۔ بعض پتھر واپس لوٹتے ہیں مگر کچھ دیر کے بعد زمین پر گر جاتے ہیں لیکن جو شعاعیں ہیں جو روحانیت کی مثال ہیں کیونکہ اللہ نے روحانیت کو نور سے تشبیہ دی ہے وہ جب کسی جگہ سے ٹکرا کر واپس لوٹتی ہیں تو رستے میں نہیں گر جایا کرتیں۔ ان کا سفر مستقل ہوتا ہے۔ کسی وقت، کسی جگہ وہ ختم نہیں ہوتا۔

تو اس طرح یہ نہ سمجھیں کہ ہر شخص کے ساتھ ایک ہی سلوک ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو دنیادار ہوں ان کے پتھر دنیا کی طرف لوٹ جایا کرتے ہیں۔ کچھ دیر کے لئے خدا کی طرف حرکت کی اور پھر وہ پتھر بیچ میں معلق ہوئے اور گر گئے اور وہ جو خدا تعالیٰ کی شعاعیں اپنے دل میں رکھتے ہیں جن کو جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے نور کہا جاتا ہے وہ جب بھی کسی ایسی حالت سے ٹکراتے ہیں جو صدمے کا موجب بنتی ہے تو بعینہٖ اسی شدت اور اسی رفتار کے ساتھ خدا کی طرف واپس مڑنے لگتے ہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں وہ فطرتاً اور طبعاً اعمال حسنہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اپنے اندر ایک قلق اور کرب محسوس کرتے ہیں۔ یہ واحد کا صیغہ چل رہا تھا اس لئے وہی کہنا چاہئے۔ ایسا انسان "اعمال صالحہ کی طرف رجوع کرتا ہے اپنے اندر ایک قلق اور کرب محسوس کرتا ہے جو اسے بیدار کرتا ہے اور نیکیوں کی طرف کھینچے لئے جاتا ہے"۔ یہ بیداری ہے جو مستقل بیداری ہے عارضی بیداری نہیں۔ "اور گناہ سے ہٹاتا ہے جس طرح پر ہم ادویات کے اثر کو تجربے کے ذریعے سے پالیتے ہیں اسی طرح پر ایک مضطرب الحال انسان جب خدا تعالیٰ کے آستانے پر نہایت تذلل اور نیستی کے ساتھ گرتا ہے اور رقت کہہ کر اس کو پکارتا ہے اور دعائیں مانگتا ہے تو وہ رویائے صالحہ یا الہام صالحہ کے ذریعے سے ایک بشارت اور تسلی پالیتا ہے"۔ (ملفوظات جلد اول، جدید ایڈیشن، صفحہ ۱۰۰، ۱۰۱)

یہ مضطرب الحال جو آستانۂ الوہیت پر گرتے ہیں یہ وہی ہیں جن کا میں ذکر پہلے کر چکا ہوں جو دل میں ایک روحانیت کا مرتبہ رکھتے ہیں اور وہی روحانیت کا مرتبہ ہے جو انہیں پھر ہمیشہ خدا کی طرف مائل رکھتا ہے ورنہ یہ اس کی ہمیشگی کی توفیق ممکن نہیں۔ ملفوظات جلد اول صفحہ ۲۷۳ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں: "جگری گریہ و بکا آستانۂ الوہیت پر ہر ایک قسم کی نفسانی گندگیوں اور مفسد مواد کو لے کر نکل جاتا ہے"۔ گریہ و بکا نہیں فرمایا "جگری گریۂ و بکا آستانۂ الوہیت پر ہر ایک قسم کی نفسانی گندگیوں اور مفسد مواد کو لے کر نکل جاتا ہے"۔ یعنی محض رونے کے نتیجے میں دل کے فساد آنکھوں کی راہ سے باہر نہیں نکلا کرتے اور دل پاک و صاف نہیں ہوا کرتا بلکہ لفظ جگری کی شرط آپ نے رکھ دی ہے۔

جگری کا معنی ہے جو فی الحقیقت سچا ہو، بہت گہرائی اپنے اندر رکھتا ہو۔ تو ان معنوں میں جگری فرمایا کہ "جگری آہ و بکا آستانۂ الوہیت پر ہر ایک قسم کی نفسانی گندگیوں اور مفسد مواد کو لے کر نکل جاتا ہے"۔ جب انسان اس گریہ و زاری سے ایک دفعہ صاف کر دیتا ہے تو دوبارہ وہ مواد پھر واپس نہیں جایا کرتا۔ یہ نشانی ہے جو ہر ایک کے لئے کھلی ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ بہت مشکل مضمون ہے جسے ہم سمجھ ہی نہیں سکتے جسے پہچاننا ہمارے بس کی بات نہیں اس کو پہچاننا وقتی توبہ کے بعد پھر جو مستقل عمل باقی رہ جاتا ہے اس کو پہچاننے کے ساتھ یہ بات بھی پہچانی جا سکتی ہے۔ اگر وقتی گریہ و زاری ہو تو وقتی طور پر انسان اپنے دل کو ہلکا محسوس کرتا ہے، ہر رونے کے بعد ہلکا محسوس کرتا ہے تبھی اکثر رونے کے بعد لوگوں کو نیند آجاتی ہے، دل خالی ہو جاتا ہے، ہر بوجھ اتر گیا۔ لیکن اگر وہ جگری نہ ہو تو جو مواد دل سے نکلا ہے پھر دل اس سے بھر جائے گا اور کوئی گند نہیں ہے جو صاف ہوا ہے وہ خود گریہ کا بوجھ ہے جو صاف ہوا ہے۔

اور اس کو پاک و صاف بنا دیتا ہے ان معنوں میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں: **"اہل اللہ کا ایک آنسو جو توبۃ النصوح کے وقت نکلتا ہے ہوا و ہوس کے بندے اور ریاکار اور ظلمتوں کے گرفتار کے ایک دریا بہا دینے سے افضل و اعلیٰ ہے"**۔ وہ ایک قطرہ کیا ہے جو انسانی زندگی پر گویا رحمتوں کی بارش برسا دیتا ہے۔ ہے ایک قطرہ۔ وہ قطرہ جب خدا قبول فرما لے تو پھر وہ آسمانی زندگی پر گویا رحمتوں کی بارش بن جاتا ہے کیونکہ **اللہ سچی روح کو کبھی ضائع نہیں ہونے دیتا، سچی روح کے ساتھ اس کے حضور اگر آنسو کا ایک قطرہ بھی بہایا جائے تو پھر وہی رحمتوں کی مسلسل موسلا دھار بارشیں بن جاتا ہے۔**

توتوبۃ النصوح جو فرمایا اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی توبہ کہ اس کے بعد ان اعمال کا کوئی دھیان ہی دل میں نہ آئے جن اعمال سے توبہ کی ہے خیال بھی نہ گزرے اور یہ توبہ تبھی ممکن ہے اگر ان اعمال کی کراہیت، ان کی بدی، ان کی نحوست کا انسان کو سچا علم ہو۔ اب یہ جو مضمون ہے توبۃ النصوح کا اسے پانا بہت مشکل ہے کیونکہ یہ درست ہے کہ اللہ کے مومن بندے اپنے بعض اعمال کی بدی سے آگاہ ہو جاتے ہیں لیکن جزوی طور پر، اور جزوی طور پر جن سے آگاہ ہو جاتے ہیں ان کو واقعۃً چھوڑ بھی دیتے ہیں۔ مگر جیسا کہ میں بارہا عرض کر چکا ہوں یہ ایک جاری سفر ہے۔ ہر اہل اللہ کے اپنے اپنے درجے اور مراتب ہیں، ان کے مطابق یہ سفر ہمیشہ باقی رہتا ہے لیکن توبۃ النصوح ایک اور چیز کا نام ہے۔

توبۃ النصوح کا مطلب ہے کہ کلیۃً تمام اعمال سیئہ، تمام بدیاں اس طرح بھیانک طور پر انسان کے سامنے ننگی ہو کر آجاتی ہیں کہ ان میں سے ایک کے ساتھ بھی پھر رغبت باقی نہیں رہتی۔ یہ بدی کی طرف رغبت کا نہ ہونا، آگے ایک بہت مشکل مضمون کا تقاضا کر رہا ہے جو مشکل بھی ہے اور آسان بھی۔ آسان ان معنوں میں ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں اگر اللہ سے تعلق سچا ہو جائے تو پھر ایک توبۃ النصوح کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ہر وہ چیز جو اللہ کے تعلق کی راہ میں حائل ہوتی ہے وہ مکروہ اور نہایت گندی دکھائی دیتی ہے۔ جو بھی اس تعلق کو توڑنے والی چیز ہو انسان اس سے تعلق توڑ لیتا ہے اور دوسرا دعاؤں کے نتیجے میں اور محنت کے نتیجے میں۔ وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ یہ مضمون چل رہا ہے اس کا یعنی توبۃ النصوح تک پہنچنے کے لئے ایک لمبے سفر کی منازل ہیں جو بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ، بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ ہر قدم پر صبر اور صلوٰۃ کا محتاج کرتی چلی جاتی ہیں۔

اب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایک نسبتاً لمبا اقتباس پڑھتا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ اس بقیہ وقت میں یہ ختم ہو سکے گا کہ نہیں مگر جتنا بھی ہے اسی پر آج خطبے کا اختتام ہوگا۔ فرماتے ہیں: "یاد رہے کہ خشوع اور عجز و نیاز کی حالت کو یہ بات ہرگز لازم نہیں ہے کہ خدا سے سچا تعلق ہو جائے"۔ اب متنبہ فرما رہے ہیں سب کو۔ "یاد رہے کہ خشوع اور عجز و نیاز کی حالت کو یہ بات ہرگز لازم نہیں ہے کہ خدا سے سچا تعلق ہو جائے بلکہ بسا اوقات شریر لوگوں کو بھی نمونۂ قہرِ الٰہی دیکھ کر خشوع پیدا ہو جاتا ہے"۔ وہی پتھر والی بات کہ وہ رستے میں گر جاتا ہے پھر۔ یہاں سے مضمون شروع ہوتا ہے اور پھر آگے اس مضمون کے باریک در باریک پہلوؤں پر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام روشنی ڈالتے چلے جاتے ہیں۔

"بسا اوقات شریر لوگوں کو بھی نمونۂ قہرِ الٰہی کو دیکھ کر خشوع پیدا ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ سے ان کو

کچھ بھی تعلق نہیں ہوتا اور نہ لغو کاموں سے ابھی رہائی ہوتی ہے مثلاً وہ زلزلہ جو چار اپریل ۱۹۰۵ء کو آیا تھا"۔ یہ کانگڑے کا زلزلہ مشہور ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیشگوئی کے عین مطابق وہ نہایت ہولناک زلزلہ آیا جس نے ایک وسیع علاقے پہ تباہی مچادی تو فرمایا، "اس کے آنے کے وقت لاکھوں دلوں میں ایسا خشوع اور سوز و گداز پیدا ہوا تھا کہ بجز خدا کے نام لینے اور رونے کے اور کوئی کام نہ تھا"۔ وہ جھٹکے جو تھے وہ بہت دنوں تک بار بار آتے رہے اس لئے اس سارے عرصے میں، جس عرصے میں زمین دہلتی رہی ان کے دل بھی دہلتے رہے اور خدا کے خوف سے بار بار رونا آتا تھا اور اس کی طرف بظاہر متوجہ ہوتے تھے۔

"یہاں تک کہ دہریوں کو بھی اپنا دہریہ پن بھول گیا تھا"۔ اس قسم کے اور بہت سے واقعات ہماری تواریخ میں بھی محفوظ ہیں۔ کوئٹے کے زلزلے کے وقت بھی کیا ہوا تھا۔ کس طرح بعض دہریہ اس وقت خدا کے قائل دکھائی دینے لگے تھے لیکن جب وقت گزر گیا تو پھر اسی طرح پرانی زندگی کی طرف لوٹ گئے۔ "اور پھر جب وہ وقت جاتا رہا اور زمین ٹھہر گئی تو حالت خشوع نابود ہو گئی"۔ "زمین ٹھہر گئی"۔ اس وقت خشوع کی حالت جو ایک قسم کا اضطراب دکھاتی ہے وہ دل کے اضطراب کی کیفیت بھی ٹھہر گئی وہ زمین سے وابستہ تھی نہ کہ تعلق باللہ۔ پس جب زمین ٹھہر گئی تو دل کا اضطراب بھی ٹھہر گیا۔

فرماتے ہیں: "سنا ہے کہ بعض دہریوں نے جو اس وقت خدا کے قائل ہو گئے تھے بڑی بے حیائی اور دلیری سے کہا کہ ہمیں غلطی لگ گئی تھی کہ ہم زلزلے کے رعب میں آ گئے ورنہ خدا نہیں ہے۔ غرض جیسا کہ ہم بار بار لکھ چکے ہیں خشوع کی حالت کے ساتھ بہت گند جمع ہو سکتے ہیں"۔ اس لئے ہر انسان اپنی خشوع کی حالت کا تجزیہ کر سکتا ہے۔ جب تک گند ساتھ جمع ہیں اس حالت خشوع کا نام ایک افسانوی خشوع ہے فرضی اور خیالی اور کہانیوں کا خشوع، اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ "البتہ وہ تمام آئندہ کمالات کے لئے تخم کی طرح ہے"۔ فرمایا ایک بیج کی طرح ضرور ہے۔ وہ وقت جب انسان کا دل متزلزل ہو چکا ہو اور وقتی طور پر ہی سہی، خشیت طاری ہو وہ آئندہ انسان میں نفس کی تبدیلی کے لئے ایک بیج کا کام دے سکتا ہے اور اس کے نتیجے میں جو سفر شروع ہو وہ ایک دائمی سفر بن سکتا ہے۔

"مگر اسی حالت کو کمال سمجھنا اپنے نفس کو دھوکہ دینا ہے بلکہ بعد اس کے ایک اور مرتبہ ہے جس کی تلاش مومن کو کرنی چاہئے اور کبھی بھی آرام نہیں لینا چاہئے اور سست نہیں ہونا چاہئے"۔ اِستَعِین میں یہ تلاش کا معنیٰ، کبھی آرام نہ کرنا اور کبھی سست نہ ہونا، وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ یہ سارا مضمون اسی آیت سے تعلق رکھتا ہے۔ "جب تک وہ رتبہ حاصل نہ ہو جائے اور وہ وہی مرتبہ ہے جس کو کلام الٰہی نے ان الفاظ سے بیان فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْن"۔ یہاں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک اور پہچان ہمیں دکھا دی ہے ایک اور جانچ کا طریقہ سمجھا دیا۔ "ان الفاظ سے بیان فرمایا ہے کہ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْن یعنی مومن صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں اور سوز و گداز ظاہر کرتے ہیں بلکہ ان سے بڑھ کر وہ مومن ہیں کہ باوجود خشوع اور سوز و گداز کے تمام لغو باتوں اور لغو کاموں اور لغو تعلقوں سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں"۔

باوجود کا یہاں معنیٰ باوجود کے ان معنوں میں نہیں کہ خشوع نہ بھی ہو تو ایسا ہو۔ فرمایا کہ خشوع کی وجہ سے، خشوع کے وجود کی وجہ سے، باوجود یہاں یہ معنے رکھتا ہے۔ "باوجود خشوع اور سوز و گداز کے تمام لغو باتوں اور لغو کاموں اور لغو تعلقوں سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں اور اپنی خشوع کی حالت کو بیہودہ کاموں اور لغو باتوں کے ساتھ ملا کر ضائع اور برباد نہیں ہونے دیتے اور طبعاً تمام لغویات سے علیحدگی اختیار کرتے ہیں"۔ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْن۔ "اور بیہودہ باتوں اور بے ہودہ کاموں سے ایک کراہت ان کے دلوں میں پیدا ہو جاتی ہے اور یہ اس بات پر دلیل ہوتی ہے کہ ان کو خدا تعالیٰ سے کچھ تعلق ہو گیا ہے کیونکہ ایک طرف سے انسان تبھی منہ پھیرتا ہے جب دوسری طرف اس کا تعلق ہو جاتا ہے"۔

پس لغویات سے اعراض کا طریقہ بھی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تعلق باللہ ہی بتایا ہے۔ لغویات سے اچانک تعلق نہیں ٹوٹا کرتا وَاسْتَعِيْنُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ والا جو تعلق ہے وہ اچانک نہیں ٹوٹا کرتا اس میں لازماً صبر کے ساتھ اللہ سے مدد مانگتے ہوئے سب سے پہلی چیز جو مانگنی چاہئے اور سب سے آخری چیز جو مانگنی چاہئے وہ اللہ کا سچا پیار ہے۔ کیونکہ لغویات سے منہ موڑنے کے لئے اس میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ پیار کے نتیجے میں اگر منہ موڑتے ہیں تو یہ منہ موڑنا بہت آسان ہے۔ ایک طرف کشش زیادہ ہے دوسری طرف کم ہے، طبعی بات ہے جس طرف کشش زیادہ ہو گی چیز اسی کی طرف اٹھ جائے گی۔ دقت محسوس نہیں کرتی۔ کشش ثقل میں بھی یہی مضمون ہے اور مقناطیس جب وزنی چیزوں کو زمین سے اٹھا لیتا ہے تو کشش ثقل ختم تو نہیں ہو جاتی مگر ایک زیادہ بڑی طاقتور کشش نے اس چیز کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

پس یہ مضمون ہے جو مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بیان فرمایا ہے کہ زمینی تعلقات تمہیں ہمہ وقت اپنی طرف کھینچتے چلے جائیں گے اور اگر تم ان سے اس طرح چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہو کہ وہ طبعی ہو جائے اس میں تمہیں محنت نہ کرنی پڑے یعنی ایک دفعہ اگر تمہیں اللہ سے تعلق قائم ہو جائے تو وہ تعلق تمہیں کھینچ لے گا اور زمینی تعلق کمزور پڑ جائے گا۔ اگر یہ نہ ہو، تعلق نہ کھینچے تو پھر زمینی تعلق لازماً ہمیشہ بالآخر آپ کو اپنی طرف کھینچتا چلا جائے گا۔ "جب دل کا خدائے رحیم سے تعلق ہو جائے اور دل پر اس کی عظمت اور ہیبت غالب آجائے"۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۲۰۱، ۲۰۲)۔ یہ آخری فقرہ ہے اس اقتباس کا۔ باقی انشاء اللہ بقیہ اقتباسات آئندہ خطبے میں بیان کروں گا۔